بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا سیّد طلحہ صاحب مرحوم ایم اے

سابق پروفیسر اورینٹل کالج لاہور

(مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی (ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مئی ۱۹۷۰ء میں نزہتہ الخواطر کا آٹھواں اور آخری حصہ دائرۃ المعارف حیدرآباد سے چھپ کر آیا تو اس وقت یہ احساس یا انکشاف ہوا کہ اس چودھویں صدی ہجری کی جن نامور اور باکمال شخصیتوں کے اس جلد میں حالات ہیں۔ اور جن کی تعداد ۵۶۳ ہے۔ اب ان میں صرف مولانا سیّد طلحہ صاحب حسنی بقید حیات ہیں، باقی سب دار فانی سے رحلت کر چکے، اس احساس و دریافت میں حسرت و مسرت کی آمیزش تھی، حسرت زیادہ کہ اب ان صاحبان فضل و کمال میں سے کوئی بھی اس دنیا میں موجود نہیں جو ایک جوہر شناس مؤرخ و سوانح نگار کے قلم سے کھینچی ہوئی اپنی تصویر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔ اور اپنے علمی و عملی کارناموں اور کوششوں کی داد پا سکے۔ تھوڑی سی مسرت اس بات کی تھی کہ ایک ہستی ابھی ایسی موجود ہے جو اس کتاب میں اپنا تذکرہ پڑھے گی اور جن معاصرین کے حالات اس کتاب میں ہیں ان میں سے اکثر کے چہرے اس کے جانے پہچانے ہیں، نامور معاصرین کی زندگیوں کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان کے متعلق

وہ بڑی جچی تلی اور بے لاگ رائے رکھتے تھے۔ انسانی زندگیوں کے بڑے باریک پہلوؤں پر اور مشاہیر و اہل کمال کے دلچسپ و حیرت انگیز تناقضات پر جو بشریت کا خاصہ اور خاص حالات و واقعات کا نتیجہ ہوتے ہیں، ان کی بڑی گہری نگاہ تھی اس لئے اندازہ تھا کہ اس جلد کے مطالعہ سے وہ جتنے لطف اندوز و محظوظ ہوں گے۔ شاید اس برصغیر میں کوئی اور نہ ہو سکے اور اس کے متعلق جیسی مبصرانہ اور ناقدانہ رائے وہ دے سکتے ہیں، شاید کوئی دوسرا نہ دے سکے۔ پھر مصنف مرحوم سے ان کو قرابت[۱]، رفاقت، محبت و عقیدت کا جو تعلق رہا ہے۔ اس کی بناء پر وہ جس ذوق و سرشاری کے ساتھ اس کتاب کو پڑھ سکیں گے وہ کسی دوسرے اہل علم کے لئے مشکل ہے۔

اس کا نتیجہ تھا کہ جب یہ کتاب چھپ کر آئی تو میری سب سے بڑی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ کتاب جس کی سات جلدیں ان کے مطالعہ سے بار بار گزری تھیں، جلد سے جلد ان کے پاس پہنچ جائے۔ زندگی کا چراغ گل ہوتے کچھ دیر نہیں لگتی، اور اب تو اس کی عمر اسی/۸۰ سے متجاوز تھی اور وہ عرصہ سے چراغِ سحری ہوئے تھے۔ کچھ وقفہ کے ساتھ کراچی سے جب کوئی خط آتا تو دل ڈرتا تھا کہ کہیں اس میں واقعہ کی خبر نہ ہو۔ جو کسی نہ کسی دن پیش آنا تھا، ادھر پاکستان کے نئے قانون کی رد سے کوئی کتاب، خواہ وہ کیسی معصوم علمی و ادبی و دینی کتاب ہو، ہندوستان سے پاکستان نہیں جا سکتی تھی۔ خدا جانے اس عرصہ میں کتنے مصنفین کی حسرتوں کا خون ہوا۔ اور کتنے شائقین علم کیسے کیسے محبوب مصنفین اور دوستوں کی تحریروں اور کیسی کیسی مفید اور ضروری کتابوں کے مطالعہ کا اشتیاق اور حسرت لے کر دنیا سے چلے گئے۔

[۱] وہ مصنف نزہتہ الخواطر کے بہنوئی تھے، میری بڑی پھوپھی صاحبہ ان سے منسوب تھیں۔ اس تقریب سے ہمارا گھر ان کا گھر اور ان کا گھر ہمارا گھر تھا

بڑی بے کلی اور بے چینی تھی کہ یہ کتاب (جس میں سینکڑوں کی تعداد میں ان مشاہیر اور اہل علم کا بھی تذکرہ ہے. جو اس سرزمین کی خاک سے اٹھے اور وہیں پیوند زمین ہوئے. جو اب پاکستان میں شامل ہے) دو چار پاکستانی علماء اور احباب کے ہاتھوں میں پہنچے جو اس کے لئے چشم براہ ہیں، اور جن کو اپنی تحقیقات اور تصنیفات میں اس سے کام لینا ہے. اس میں سر فہرست مولانا سید طلحہ صاحب کا نام تھا اس میں کچھ جذباتی اور ذاتی لگاؤ بھی تھا. اور مسئلہ خاص علمی وافادی نہ تھا. شخصی اور خاندانی بھی تھا اس میں کچھ خودغرض اور طفلانہ خواہش بھی شامل تھی. درحقیقت زندگی کی لذت بہت کچھ انہیں چیزوں کے دم سے ہے جو خالص عقل و فلسفہ کی پیداوار نہیں جی یہ چاہتا تھا کہ وہ اس کتاب کو پڑھکر اپنے قلبی تاثرات کا اظہار کریں اور مصنف کی محنتوں اور کوششوں کی داد دیں، اپنا پرانا زمانہ یاد کریں اور یاد دلائیں جب وہ لاہور سے گرمیوں کی تعطیلات میں آئے تھے اور مصنف اس کتاب کے بعض مقامات ان کو پڑھ کر سناتے تھے، دل کا ایک چور یہ بھی تھا. کہ یہ معلوم ہو کہ راقم سطور نے اس میں اپنے اضافہ کا جو پیوند لگایا اور قلم سے قلم ملانے کی کوشش جو کی ہے اس میں وہ کہاں تک کامیاب رہا؟ یہ بات جیسی بصیرت واعتماد اور صفائی و بے باکی کے ساتھ وہ بتا سکتے ہیں کوئی دوسرا نہیں بتا سکتا. اس لئے کہ برصغیر میں دو چار ہی آدمی ایسے ہوں گے جو عربی انشاء و تحریر کا اتنا صحیح ذوق اور عربی کی اسالیب بیان پر ایسی ناقدانہ نگاہ رکھتے ہوں، پھر وہ میرے استاد بھی ہیں اور بزرگ بھی. وہ اس بارے میں کسی رعایت سے کام نہ لیں گے. ان کے اعتراف کے دو جملے میرے لئے تعریفوں کے بیسیوں صفحات پر بھاری ہیں.

خدا کی مہربانی سے ایک ایسا موقع و ذریعہ ہاتھ آگیا کہ یہ کتاب جون کے آخر میں ان کو مل گئی، اور جیسی توقع تھی انہوں نے ضعف اور بیماریوں کے باوجود کم سے کم مدت میں اس کا مطالعہ کرلیا اور اس تحفہ کی مفصل رسید بھیجی جو اس کتاب پر کہا جاسکتا ہے کہ سب سے بڑا منصفانہ و مبصرانہ تبصرہ تھا۔ جن لوگوں کو تحریر و تصنیف کا تھوڑا بہت تجربہ ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک مصنف کے لئے جس نے اپنی تصنیف میں خون جگر صرف کیا ہو بعض اوقات تعریف کے صفحات کے صفحات سے وہ خوشی نہیں ہوتی اور ان کو وہ اپنی محنت کی اصل داد نہیں سمجھتا۔ جتنا کسی مبصر کے دو جملے جن سے تصنیف کے اصل جوہر و مصنف کی اصل محنت کا اظہار ہوتا ہے کام کر جاتے ہیں، اور اس کی ساری محنت وصول ہو جاتی ہے یہ خط کچھ اس طرح کا تھا اس اعتراف کے ساتھ کہ کتاب کی تکمیل کرنے والا اپنی پیوندکاری میں بڑی حد تک کامیاب ہوا ہے۔ اس کی تحریر پر ایک دو استادانہ اصلاحات بھی تھیں، بہر حال خدا نے بڑی آرزو پوری کی اور یہ کتاب ان کی زندگی میں چھپ بھی گئی اور انہوں نے ملاحظہ بھی فرمالی۔ اس دور میں جبکہ فضل و کمال کا اعتراف "داد و ستد"، کا معاملہ رہ گیا ہے۔ اور صرف شہرت و ناموری، کسی خاص جماعت و گروہ سے انتساب، تصنیفات کی کثرت، یا تلامذہ و معتقدین کے حلقہ کی وسعت ہی کسی آدمی کے قابل تعریف و تعارف ہونے کا معیار رہ گیا ہے۔ اور بد قسمتی سے ان میں سے کوئی بات ان کو حاصل نہ تھی، انہوں نے اپنا تذکرہ جو حق تلفی اور مبالغہ دونوں سے مبرا تھا خود پڑھ لیا۔ اپنے خط میں انہوں نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا، اور نہ ان سے اس کی امید تھی۔ لیکن میں اپنے قلب کو اطمینان و مسرت سے لبریز پاتا ہوں کہ

یہ کتاب ان کی نظر سے گذر گئی ورنہ بہت سی حسرتوں کے ساتھ یہ حسرت بھی رہ جاتی کہ یہ کتاب جب شائع ہوئی تو وہ اس دنیا میں نہ تھے، وہ فلاں شخصیت کا ترجمہ پڑھتے تو خوش ہوتے۔ اور اس کی تصویر ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتی فلاں بزرگ کا حال پڑھتے تو اس کی داد دیتے اور شاعر کی زبان میں کہنا پڑتا کہ :-

ع یک حرف کاش کیست کہ صد جا نوشتہ ایم

بالآخر اس جلد کا یہ ورق بھی الٹ گیا اور اس کی شخصیتوں میں سے یہ آخری شخصیت جو کتاب کی اشاعت کے بعد زندہ تھی، ان باکمال لوگوں کی صف میں شامل ہو گئی جو اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، اور اب ان اہلِ کمال کی طویل فہرست میں ایک نام بھی ایسا نہیں ہے جس سے اس دنیا میں ملاقات ہو سکے یا اس کے فضل و کمال سے استفادہ کیا جا سکے، ستمبر ۱۹۷۰ء کی آخری تاریخ تھی کہ کراچی سے پہلے ان کے بھتیجے عزیزی سید ی حسین سلمہٗ پھر ان کے چھوٹے بھائی محترم سید ابوبکر صاحب حسنی کا خط ملا کہ "مولانا سید طلحہ صاحب نے ۲۳ رجب ۱۳۹۰ھ (۲۵ ستمبر ۱۹۷۰ء) جمعہ کے دن دس بجے دن کو کراچی کے ایک اسپتال میں جان جانِ آفریں کے سپرد کی، کم از کم نزہتہ الخواطر کی بزم اہل کمال کو سامنے رکھتے ہوئے غالب کا یہ شعر بالکل حسب حال ہے۔

داغ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

خطوط کی اطلاع کے مطابق اسی روز جمعہ کو بعد نماز عصر شہر کے مرکز زندگی سے میلوں دور مجاہد آباد کالونی کے ایک دور افتادہ قبرستان میں جہاں اس سے پہلے

غالباً ان کے نامور خاندان کا کوئی فرد دفن نہیں ہوا تھا وہ سپردِ خاک کئے گئے۔ دفن کرنے والوں میں بہت کم لوگوں کو اس کا حقیقی علم وادراک ہوگا کہ وہ کس جامع کمالات ہستی، قدیم وجدید، مشرقی ومغربی علوم اور عقلیات ونقلیات کے کس مجمع البحرین اور علم ومعلومات کے کس خزانہ کو، جو عمر بھر "کنزِ مخفی" رہا، ہمیشہ کے لئے زمین میں دفن کر رہے ہیں اور کراچی کے اس شہر کو خطاب کرکے جو ہمیشہ سے صرف ایک بڑا تجارتی مرکز رہا ہے اور اب بھی علم وکمال کا حقیقی طور پر جوہر شناس نہیں، غالب کا یہ شعر سنانا صحیح ہوگا کہ ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کئے

آج جب کہ ان کے انتقال کو پندرہ سولہ روز ہوئے ہیں، اور مشرقی یوپی کی طوفانی بارشوں اور سٹی ندی کے سیلاب کی لائی ہوئی پریشانیوں سے نجات پاکر اپنے اس مستقر (دائرہ شاہ علم اللہؒ) پر واپس آنا نصیب ہوا ہے۔ جو ان کے آباءِ کرام کا مسکن ومدفن ہے اور جہاں انھوں نے اپنی زندگی کے غالباً سب سے زیادہ سکون ومسرت کے دن گذارے ہیں، تو داغِ کہن تازہ ہوگئے، وہ پرانی صحبتیں، ان کی پرلطف مجلس، ان کے علمی افادات وتحقیقات، ان کے تبصرے وتذکرے ایک ایک کرکے حافظہ کے اندر ابھرنے لگے، اور تصویر کی طرح آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ آج قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھا ہوں کہ ان کے متعلق لکھوں اور جو نہیں جانتے ان کو بتانے کی کوشش کروں کہ ۲۵ ستمبر کو نہایت گمنامی وخاموشی کے ساتھ علم وکمال کی کون سی شمع گل ہوئی تھی، اور علمائے وسلف کی جن کا اصل سرمایۂ زندگی،

ٹھوس علمی استعداد، نگاہ کی گہرائی اور گیرائی اور علوم و کمالات کا تفنن و تنوع تھا۔ کون سی نشانی نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے مستور ہوگئی۔

لیکن کہانی کہاں سے شروع کروں، اور ان کے اصناف کمال میں سے پہلے کس کمال کا تذکرہ کروں۔ وہ میری نگاہ میں صرف و نحو کے امام تھے۔ عربی کے ایسے ادیب و عالم تھے کہ عہد جاہلی و اسلامی کے مسلم الثبوت شعراء کے کئی ہزار شعر ممکن ہے کہ ان کی تعداد دس ہزار سے کم نہ ہو ان کو حفظ اور نوکِ زبان تھے۔ اسی طرح اساتذۂ فارسی و اردو کا منتخب کلام ان کو بکثرت یاد تھا۔ عربی کے علوم بلاغت معانی و بیان پر ان کی وسیع اور گہری نظر تھی۔ اور اعجاز القرآن پر اس برصغیر پاکستان و ہند کے چند ہی علماء کا مطالعہ اتنا وسیع ہوگا۔ اور اس کا علم ایسا مستحضر ہوگا جیسا ان کو تھا[۱]۔ اصول فقہ کا علم کلام کی قدیم کتابوں پر جو آئمہ و فن کے قلم سے نکلی ہیں، ان کی مدرسانہ اور استادانہ نگاہ تھی، منطق و فلسفہ کی اعلیٰ و معیاری کتابوں پر حاوی تھے۔ جہاں تک تاریخ اسلام کا تعلق ہے اس برصغیر میں ان سے زیادہ اگر کسی کا علم ہو تو مجھے انکار نہیں، "فوق کل ذی علم علیم" لیکن میرے علم و واقفیت کی حد تک اسلامی تاریخ، اس کے سنین، اور اس کے اہم واقعات کسی کو اتنے مستحضر و محفوظ نہیں تھے۔ جتنے ان کو تھے، کہا جاسکتا ہے کہ وہ تاریخ کی ایک بولتی ہوئی کتاب تھے جس کو کسی سند یا واقعہ کے بیان کرنے میں اصل ماخذوں کی طرف مراجعت کرنے کی کم ضرورت پیش آتی۔ اس میں بہت کچھ ان کے غیر معمولی حافظہ کو دخل تھا جس کی بدولت

---

[۱] :- اس کا شاہد ان کا وہ فاضلانہ مضمون ہے جو اعجاز القرآن اور قرآنی بلاغت کے نکتوں پر غالباً ۳۱-۳۲ء میں رسالہ "جامعہ" دہلی کے ایک ضخیم نمبر میں شائع ہوا تھا۔

انہوں نے اپنی تعلیم سے فراغت کے بعد صرف چار مہینہ میں قرآن حفظ کر لیا۔ اور جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ آخر تک بہت پختہ تھا۔ نیز ان کے فطری تاریخی ذوق کو جس کو ہم تاریخی حاسہ سے تعبیر کر سکتے ہیں اور جو ہر ایک کو فطرت سے نہیں ملا کرتا۔ اس سے ان کے اندر ایک ایسا ملکہ پیدا ہو گیا تھا کہ کسی تاریخی غلطی کے گرفت کرنے کے لئے ان کا ذوق سلیم اور ان کا بالغ تاریخی شعور کافی تھا۔ جیسے بعض فطری شاعر اور ماہرین فن، فن عروض کی مدد کے بغیر موزوں شعر کہتے ہیں اور شعر کی عدم موزونیت یا بحر سے الگ ہو جانے کا ادراک کر لیتے ہیں، ان کے تاریخی شخصیتوں کے سنن وفات اور اہم تاریخی واقعات یاد کرانے کے عجیب عجیب چٹکلے اور آسان نسخے تھے، جو ان کے خداداد حافظہ کا نتیجہ تھے۔ علم فرائض میں بھی مہارت تھی، اور اس کی مشق کرانے کا بڑا ذوق تھا، نجوم کی معرفت ان کے طلوع و غروب کے اوقات و برج کو خوب پہچانتے ہیں اور اپنے ہم نشینوں اور شاگردوں کو اس علم اور ذوق میں شریک کرنے کا ایسا شوق تھا جو میرے جیسے بدذوق اور کم نگاہ آدمی کے لئے بعض اوقات آزمائش بن جاتا۔ ہیئت، فلکیات اور جغرافیہ سے ہر دور میں ان کو مناسبت اور ذوق رہا۔ اور اس کے خصوصی عالم اور ماہر کہیں مل جاتے تو سب بھول کر اپنے علم و معلومات کی توسیع اور اس سے استفادہ کرنے میں مشغول ہو جاتے۔ علم مجلسی، اور معلومات عامہ میں ان کی مشکل سے ہی نظیر ملے گی۔

ہر طرح کے رطب و یابس، ہزلیات و مطائبات اور نوادر و حکایات ان کو یاد تھیں طبقات رجال اور تراجم و احوال ان کے مطالعہ کا خاص موضوع تھا اور

مشکل سے کوئی اہم تذکرہ اور تراجم کی کتاب ان کی نظر سے مخفی رہی ہوگی. قدیم شخصیتوں کے مرتبوں اور ان کے مراتب کے تعین و ترتیب سے بڑے باخبر تھے. ان کی مجلسوں میں سلف کی عظمت متقدمین کے مراتب سے واقفیت اور آئمۂ اہل سنت و محدثین کی محبت وعقیدت ضرور پیدا ہو جاتی تھی، اس بارے میں ذاتی طور پر مجھ پر ان کا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے صحابہ وسلف کی عظمت اور آئمہ محدثین اور سنت کے علمبرداروں کی محبت وعقیدت ایسی دل میں جاگزین کردی کہ کسی دور میں بھی کوئی مطالعہ اور تحقیق اور کوئی صحبت اس پر اثرانداز نہیں ہوتی۔

مولانا سید طلحہ صاحب کے والد کا نام سید محمد تھا. جو ریاست ٹونک میں معتمد الملک ظفر جنگ کے لقب سے ممتاز اور ناظم پرگنات (کلکٹر) کے عہدہ پر فائز تھے. سید محمد صاحب حضرت سید احمد شہیدؒ کے بڑے بھانجے مولوی سید محمد علی مصنف مخزن احمدی کے حقیقی پوتے تھے. ان کو اس طرح سید احمد شہید سے قرابت قریبہ حاصل تھی. مولانا سید طلحہ صاحب کے چچا بخشی سید محمد عثمان بھی مالیات کے ایک بڑے منصب پر سرفراز تھے ان کے خاندان کو ریاست میں بڑی دنیاوی و دینی وجاہت حاصل تھی. اور اس کو ریاست کی طرف سے بڑی جاگیر ملی ہوئی تھی. انہوں نے بڑی فارغ البالی بلکہ ایک طرح سے تنعم اور امارت کے ماحول میں آنکھیں کھولیں، اور زندگی کا ابتدائی زمانہ گذارا، ان کی پیدائش ۱۳۰۸ھ (۱۸۹۰ء) میں وہیں محلہ قافلہ[۱] ٹونک میں ہوئی اور وہیں ابتدائی تعلیم پائی. وہ دس سال

[۱] : محلہ قافلہ ریاست ٹونک کا مشہور محلہ ہے جس کو سید احمد شہیدؒ کی شہادت کے نواب وزیر الدولہ والی ٹونک نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان اور قافلہ کے لئے بسایا تھا اور ان میں ان حضرات کو آباد کیا۔

کے تھے کہ ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء) میں ان کے عزیز و بزرگ مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب مددگار ناظم ندوۃ العلماء اپنے اعزہ و بزرگوں سے ملنے کے لئے ٹونک آئے جب کچھ دن قیام کرنے کے بعد واپس جانے لگے تو بزرگوں نے دینی تعلیم کے لئے اس ہونہار بچہ کو ان کے ساتھ کر دیا اور وہ لکھنؤ آکر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہو گئے اور انہوں نے وہیں کئی سال تک تعلیم حاصل کی۔

اس وقت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ ناظم، علامہ شبلی نعمانیؒ معتمد، اور ان کے قابل فخر استاد مولانا محمد فاروق چریا کوٹیؒ صدر مدرس اور مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ طالب علم تھے۔ پھر لوٹے ٹونک میں جوان کا دوسرا آبائی وطن اور اپنے وقت میں ایک بڑا علمی و دینی مرکز تھا۔ مدرسۂ ناصریہ میں مولانا سیف الرحمٰن صاحب مہاجر کابل اور مولانا حیدر حسن خان صاحب سابق شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء سے علوم کی تکمیل کی، پھر درسِ نظامی کے عام فضلاء کے معمول و دستور کے مطابق ذریعۂ معاش کے لئے مطب کا انتخاب کیا۔ اور دہلی جاکر خاندانِ شریفی کے مقتدر فرد حکیم غلام رضا خان صاحب سے باقاعدہ طِبّ کی تعلیم حاصل کی اور کچھ عرصہ بمبئی میں مطب بھی کیا۔[1]

اس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات کا سارے ہندوستان میں چرچا تھا۔ اور ذی استعداد اور حوصلہ مند طلباء ملک کے گوشہ گوشہ سے کھنچ کر

---

[1] : طب سے مولانا کو آخر دم تک مناسبت رہی، مجھے خوب یاد ہے کہ جب والد صاحب مرحوم کئی روز کے لئے لکھنؤ سے باہر جاتے تو مولانا ان کی جگہ مطب میں بیٹھتے۔ کچھ عرصہ لکھنؤ کی گنجے والی گلی میں مستقل مطب بھی کیا۔

مولوی فاضل و منشی فاضل کا امتحان دینے لاہور جاتے تھے، شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس عہد کے بہت سے نامور فضلاء اپنی جوانی میں اس منزل کو طے کرچکے ہیں، عربی زبان کے مشہور محقق علامہ عبدالعزیز میمن مولوی فاضل ہیں اور مناظر اہل سنت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری ہمیشہ اپنے رسالہ "اہل حدیث" کے سرورق پر اپنے نام کے ساتھ مولوی فاضل لکھتے رہے ہیں، مولانا سید طلحہ نے بھی مولوی فاضل و منشی فاضل کا امتحان دیا اور جہاں تک مجھے یاد ہے وہ مولوی فاضل کے امتحان میں ساری یونیورسٹی میں اول آئے، یہی ان کے اورینٹل کالج لاہور میں بحیثیت استاد کے تقرر کی تقریب بن گئی، وہ ۱۳۳۵ھ (۱۹۱۶ء) میں کالج کے استاد مقرر ہوئے اور پورے پچیس سال اس عہدہ پر قائم رہے۔ اس طرح انہوں نے اپنی زندگی کے طویل ترین اور خوشگوار ترین مدت لاہور میں گذاری جو ہر طرح کے اہل کمال کا ملجا و ماویٰ اور ہر ذوق، ہر تحریک، ہر سرگرمی اور ہر مسلک و خیال کا مرکز تھا، وہ لاہور کی علمی و ادبی سوسائٹی اور حلقہ میں نہ صرف مانوس بلکہ مکرم و محترم رہے۔ ان مختلف حلقوں اور ذوق سے تعلق و رابطہ اور کسی ایک ادارہ یا جماعت سے عدم وابستگی نے ان کے کمالات میں رنگارنگی ان کے ذہن میں وسعت و جامعیت پیدا کردی۔ اس جماعتی عصبیت اور تنگ نظری سے ان کو محفوظ رکھا۔ جو پوری عمر کسی مخصوص ادارہ میں گذار دینے والوں میں عام طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ علم کے بلبل شیدا کی طرح ہر شاخِ گل پر بیٹھتے اور چہکتے، شہد کی مکھی کی طرح ہر پھول سے رس چوستے اور اس کو شہد خالص میں تبدیل کر دیتے۔ علم کے ہر چشمۂ شیریں سے اپنی پیاس بجھاتے ہر صاحب کمال اور کسی فن میں بھی امتیازِ خاص رکھنے والے کے

سامنے ان کو زانوئے تلمذ تہ کرنے اور طالب علمانہ استفادہ کرنے میں تکلف نہ تھا علم کے بازار میں ان کا نعرہ "ھَل مِن مَزید" اور "ھَل مِن جدید" تھا، اس عادت نے جو ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، ان کو علمی طور پر جتنا فائدہ پہنچایا ہو' ان کے فضل و کمال پر ہمیشہ پردہ ڈالا اور اچھے اچھے محرمانِ راز سے ان کے علمی مرتبہ و مقام کو مخفی رکھا۔

ظاہر پرست معاشرہ نے کبھی ان لوگوں کا قصور معاف نہیں کیا جو اپنے کمال کا اظہار کرنے اور دوسروں پر اپنا علمی تفوق قائم کرنے کے بجائے نئے پھولوں اور موتیوں کے لئے اپنا دامن پھیلائیں اور اپنی طلب و اشتیاق کا اظہار کریں بعض اوقات بے علم و کم نگاہ ہموطنوں نے نہیں مؤرخوں اور سوانح نگاروں نے بھی بعض ایسے اہل کمال کو ایسی سزا دی ہے جو دوسروں کے لئے بھی تازیانۂ عبرت ہو، میں نے بہت سے ایسے لوگ دیکھے ہیں، جو تھوڑی معلومات اور محدود مطالعہ سے بہت بڑا کام لے لیتے ہیں اور اپنی عظمت کا نقش قائم کر دیتے ہیں، مولانا سیّد طلحہ صاحب اس گروہ میں تھے۔ جو اپنے علمی ذوق اور استفادہ کی حرص کی وجہ سے اچھے اچھے پڑھے لکھوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیتے تھے کہ وہ اس موضوع سے ناواقف اور اس کوچہ سے نابلد ہیں۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ان کو علمی دنیا میں جو شہرت اور علمی حلقوں میں جو عزت و احترام حاصل ہونا چاہیئے تھا۔ وہ آخر تک نہ حاصل ہو سکا۔ اور بہت کم درجہ کے لوگ شہرت و ناموری کے بام عروج پر پہنچ گئے، اس پر مستزاد ان کی بے تکلف اور سادہ زندگی تھی، لباس، طرز گفتگو، آداب مجلس وغیرہ کسی چیز میں ان کو تکلف و اہتمام گوارا نہیں تھا۔ نہایت آزاد و وارستہ مزاج

تھے۔ اپنی راحت کو دوسروں کی تنقید یا عقیدت مندی پر مقدم رکھتے اور اس کا بہت کم خیال کرتے کہ دوسرے ان کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔

لاہور میں ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع بھی تھا اور نہایت متنوع بھی، اس میں جہاں بڑی مقدس دینی شخصیتیں تھیں وہاں ادیب و شاعر، مصور و رند لاابالی بھی تھے۔ ان کے جہاں مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی صاحب امیر جماعت خدّام الدین، مولانا عبدالواحد صاحب غزنوی امیر جماعت اہل حدیث اور علماء میں سے مولانا داؤد غزنوی، مولانا کریم بخش صاحب (صدر شعبۂ عربی گورنمنٹ کالج) اور مولانا اصغر علی صاحب روحی (صدر شعبۂ عربی اسلامیہ کالج) سے تعلقات تھے۔ اور یہ سب حضرات ان کا لحاظ و احترام فرماتے تھے، کچھ تو ان کے علم و فضل کی وجہ سے اور کچھ حضرت سید احمد شہیدؒ کی نسبت سے، وہاں ان کے تعلقات انگریزی زبان، ریاضی، فلسفہ، تاریخ کے مسلم و غیر مسلم پروفیسروں اور اساتذہ فن سے بھی تھے۔ ان کے حلقۂ احباب میں خواجہ سلیم (جو فلسفۂ جدید کے ایک اچھے فاضل اور بعد میں گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے پروفیسر ہوئے) اردو زبان کے مشہور محقق پروفیسر محمود خان شیرانی، علامہ تاجور نجیب آبادی، میر اولاد حسین شاداں بلگرامی ریاضی کے مشہور استاد خواجہ دل محمد، دیوانِ غالب مصور کے مرتب اور مشہور آرٹسٹ عبدالرحمن چغتائی، ریاضیات کے مشہور استاد پروفیسر عبدالحمید، اسلامیات پر مضامین لکھنے والے خواجہ عبدالوحید، اور تعلیمی لائن کے ایک تجربہ کار استاد پرنسپل مولانا ظفر اقبال، اردو کے مشہور ناشر و خادم اور دارالاشاعت پنجاب کے بانی میر سید ممتاز علی صاحب (والد سید امتیاز علی تاج مرحوم)

سے ان کے یکساں تعلقات تھے، اور ان سب حضرات کے یہاں ان کی آمد و رفت نشست و برخواست تھی، اس وقت لاہور میں مولانا احمد علی صاحب سے زیادہ کسی کا حلقہ عقیدت و ارادت وسیع نہ تھا، مولانا کی زندگی کا خاص جوہر اشاعت قرآن اور حمایت سنت کے بعد تورع و تقوی تھا، وہ دعوت قبول کرنے اور ہر ایک کے یہاں کھانے پینے میں بہت محتاط تھے۔ نہایت صحیح الادراک اور قوی الکشف تھے۔ رمضان مبارک میں یہ احتیاط اور بڑھ جاتی، اور عشرۂ اخیرہ میں تو کسی کی دعوت قبول کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس کلیہ میں اگر کوئی استثنا تھا تو صرف مولانا سید طلحہ صاحب کا، اکثر عشرۂ اخیرہ میں ان کے مکان پر تشریف لائے اور کھانا تناول فرمایا، نماز میں بھی کبھی خلاف معمول ان کو بڑھا دیتے اور ان کی اقتدا فرماتے، ہمیشہ شاہ صاحب اور سید صاحب کے لفظ سے خطاب کرتے، دیال سنگھ کالج کے بعض غیر مسلم پروفیسروں سے بھی ان کے دوستانہ تعلقات تھے اور ان سے خصوصی مضامین میں استفادہ کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک صاحب سے جن کا نام مجھے یاد نہیں۔ وہ فلکیات کے جدید تحقیقات و نظریات میں استفادہ کرتے رہتے تھے۔

ہمارے فاضل دوست و کرم فرما ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی صاحب (جو بعد میں پنجاب یونیورسٹی میں فن تعمیر و آثار قدیمہ کے پروفیسر رہے) ان کے بے تکلف دوست اور غالباً شاگرد بھی تھے۔ انہیں کی معیت میں جو ۱۹۲۹ء میں پہلی بار لاہور حاضر ہوا۔ انہوں نے مجھے ڈاکٹر سر محمد اقبال کی خدمت میں بھیجا۔ ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی صاحب علامہ اقبال کے خاص معتمد اور بعض موقعوں پر سیکرٹری بھی رہ چکے تھے۔

اس یادگار تاریخی سفر میں جو میری زندگی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، اور انہوں نے مجھے ہر طبقہ کے اہلِ کمال سے ملایا۔ اس وقت میری عمر پندرہ یا سولہ سال کی تھی۔ انہوں نے مجھے جہاں علامہ اقبال سے ملایا اور لاہور کی مشہور علمی و تاریخی شخصیتوں سے میرا تعارف کرایا۔ وہاں رستم زماں گاماں پہلوان سے بھی ملایا۔ اسی سفر میں پہلی مرتبہ ابو الاثر حفیظ جالندھری کے ساتھ مجلس اور کھانے میں شرکت کی، اور میری فرمائش پر انہوں نے میری بعض پسندیدہ نظمیں سنائیں، اس وقت لاہور کے ادبی حلقوں میں "گلِ رعنا"، کا جو چند سال پہلے شائع ہوئی تھی بہت چرچا تھا اکثر جگہ میرا تعارف مصنف "گلِ رعنا" کے فرزند کی حیثیت سے کیا جاتا تھا۔ اور کہیں ان الفاظ میں کہ یہ بچہ بے تکلف عربی لکھتا اور بولتا ہے، علامہ اقبال کے یہاں مجھے یہ کہہ کر پیش کیا گیا کہ یہ "مصنف" گلِ رعنا" کے فرزند ہیں اور انہوں نے آپ کی بعض نظموں کا عربی نثر میں ترجمہ کیا ہے[1]۔ وہ نو وارد عزیزوں کو مشاہیر سے ملانے اور تاریخی اور قابلِ دید مقامات کی سیر کرانے میں بڑے فیاض و فراخ دل اور مستعد تھے۔ اس کے لئے اکثر خود وقت نکالتے اور اپنی وسیع معلومات سے اس سیر و سیاحت میں چار چاند لگا دیتے، میں نے اس سفر میں ان کی بدولت جو کچھ سیکھا اور دیکھا۔ اس سے پوری زندگی میں فائدہ اٹھایا۔ ان کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتا کہ وہی مولانا احمد علی صاحب سے تعارف و تعلق کا ذریعہ بنے، اور ان کی شفقتوں اور خصوصی توجہات کی سعادت حاصل ہوئی جس کا میری زندگی پر بہت گہرا اور دیرپا

[1] اس وقت میں نے اقبال کی چاند کی نظم کا ترجمہ کیا تھا، اور علامہ مرحوم نے اس کو ملاحظہ بھی فرمایا۔

نقش ہے، اور اس بناء پر اگلے سال ان کے درس میں شرکت کے لئے خصوصی طور پر لاہور کا سفر اختیار کیا۔ اور یہ تعلق یوماً فیوماً بڑھتا گیا۔

۲۲ نومبر ۱۹۳۷ء میں انہیں کی معیت میں علامہ اقبال کی خدمت میں آخری حاضری ہوئی۔ اور مسلسل ان سے کئی گھنٹہ گفتگو اور استفادہ کا موقع ملا، اس یادگار صحبت کا تذکرہ میں نے تفصیل کے ساتھ اپنے ایک اردو مضمون "عارفِ ہندی کی خدمت میں چند گھنٹے" میں کیا ہے۔ جو پنجاب کے ایک غیر مشہور رسالہ میں اسی وقت شائع ہو گیا تھا، اور بعد میں میری عربی کی کتاب "روائع اقبال" اور اس کے اردو ترجمہ "نقوشِ اقبال" کے دیباچہ میں اس کی مختصر روداد آئی ہے اس تاریخی ملاقات میں ان کے حقیقی بھانجے برادرِ عزیز مولوی سید محمد ابراہیم حسنی بھی تھے اس کے چند ہی مہینے بعد ان کی وفات کا واقعہ پیش آیا۔ اور اب وہ زرّیں موقع بہت غنیمت معلوم ہوتا ہے جب ڈاکٹر صاحب کے خادمِ خاص ان کی نقاہت اور تکان کی وجہ سے ان سے بار بار آرام کرنے کا تقاضا کرتے تھے اور وہ ٹال دیتے تھے اور مسلسل گفتگو میں مصروف تھے۔

انہوں نے اگرچہ اپنی عمر کا وہ حصہ جو تاثر قبول کرنے کا زمانہ ہوتا ہے۔ لاہور جیسے شہر میں گذارا جو دینی و ذہنی انتشار کا مرکز تھا۔ اور بڑے آزاد خیال لوگوں کے ساتھ ان کی صحبتیں رہیں لیکن ان کے عقیدہ اور عمل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ سختی سے اہل سنت کے عقائد اور اپنے خاندانی مسلک پر قائم تھے، نماز باجماعت کا ہمیشہ اہتمام رہا، دو چیزوں کا ان کو کبھی تحمل نہیں ہوا، ایک کسی کو تعدیلِ ارکان کا خیال کئے بغیر جلد جلد نماز پڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے

اس کے سلام پھیرنے کا انتظار کرتے رہتے۔ اور وہ خواہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو، اس کو ضرور نصیحت کرتے، دوسرے ٹخنے سے نیچا پائجامہ نہیں دیکھ سکتے تھے بعض کبار علماء و مشائخ تک کو اس پر ٹوک دیا کبھی کبھی اس کے لئے وہ تنبیہ کے بڑے لطیف پیرائے اختیار کرتے مثلاً کسی معزز آدمی، رئیس یا فیشن ایبل نوجوان کو دیکھتے کہ اس کا پائجامہ ٹخنے سے بہت نیچے ہے اور زمین پر لوٹتا ہے تو اس سے کہتے کہ " آپ کا جتنا پائجامہ کا پائنچہ ٹخنے سے نیچے ہے اور زمین پر لوٹتا ہے۔ اس میں مجھ جیسے غریب آدمی کی ایک ٹوپی بن سکتی ہے،، جس دعوت یا محفل میں ساز یا باجہ ہوتا اس میں شرکت نہ کرتے یا اٹھ کر چلے آتے، ایک مرتبہ مجھ سے یہ قصہ بیان کیا کہ کسی ولیمہ یا دعوت میں شریک تھا وہاں باجہ شروع ہوا، میں نے اعتراض کیا تو بند کر دیا گیا، پھر کسی " صاحبِ ذوق،، کی فرمائش پر دوبارہ شروع ہوا میں نے پھر احتجاج کیا تو وہ فرمائش کرنے والے صاحب جو ایک انگریزی تعلیم یافتہ آدمی تھے خود اٹھ کر میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا کہ مولانا! اس میں کیا شرعی قباحت ہے؟ میں نے خیال کیا کہ یہ مجھ سے بحث کریں گے اور شاید دوسروں کی تلقین کی ہوئی بعض علمی دلیلیں دیں گے میں نے ان کو خاموش کرنے کے لئے کہا کہ " مجھے ناپسند ہے یعنی اگر میری شرکت مطلوب ہے تو اسے بند کر دینا چاہیئے۔ اس پر وہ لاجواب ہو گئے،،

جدید خلافِ جمہور رجحانات اور مسلکوں میں ان کو اہلِ قرآن و منکرینِ حدیث سے نیز سر سید مرحوم کے طرزِ پر منصوصات و قطعیات کی پُر از تکلف تاویلات اور عقل پرستی سے بڑا بعد اور وحشت تھی، اور اسماء و صفات کے بارے میں

وہ سلف کے مسلک پر قائم تھے. قرآن شریف بہت پختہ اور رواں تھا اور اس
کے پڑھنے کا بہت ذوق رکھتے تھے، جب تک قوت رہی تراویح میں قرآن شریف
ختم کرنے کا اہتمام کرتے تھے. جب جوش میں آکر روانی سے پڑھتے تو سننے والوں کو بڑا
لطف آتا. اور ایک کشش محسوس ہوتی۔

۱۳۴۴ھ (۱۹۲۶ء) میں اللہ تعالیٰ نے ان کو حج کی سعادت بھی نصیب
فرمائی یہ سنہ کئی حیثیتوں سے ایک یادگار سنہ تھا اسی سال موسم حج میں سلطان
ابن سعود کی دعوت پر مکہ معظمہ میں مؤتمر اسلامی کے اجلاس ہوئے جس میں شرکت
کے عالم اسلامی کے بڑے بڑے علماء و زعماء اور مشاہیر آئے، ہندوستان سے بھی
خلافت کمیٹی اور جمیعتہ العلماء کے نمائندوں کی حیثیت سے محمد علی جوہر، مولانا شوکت
علی، مولانا ظفر علی خان، مولانا سید سلیمان ندوی، مفتی کفایت اللہ صاحب مولانا
شبیر احمد عثمانی وغیرہ حضرات نے شرکت کی، مولانا سید طلحہ صاحب کے کئی بھائی
عزیز اور دوست اس سفر میں ان کے رفیق و شریک تھے، ان کے بڑے بھائی
سید زبیر صاحب تو یہیں سے ساتھ گئے تھے. سید عمر صاحب جرمنی سے مکہ معظمہ
پہنچے اور شریک رہے، ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب، شیخ خلیل عرب اور مولانا محمد
شورتی بھی ہندوستان سے آئے تھے. اور اسی سال حج زیارت کی سعادت حاصل کی۔

لاہور کی فضا، اورینٹل کالج کی وجہ سے ان کا انگریزی امتحانات سے بچنا بہت
مشکل تھا. اعلیٰ مشرقی امتحانات دینے والوں کو یونیورسٹی نے یہ رعایت دے
رکھی تھی کہ وہ صرف انگریزی میں امتحانات دے کر ایم اے کر سکتے ہیں، چنانچہ
مولانا سید طلحہ صاحب نے یہ "ہفت خواں" سر کیا، ان کا وقت اور صلاحیت

اس میں بہت صرف ہوئی، وہ بعد میں ہمیشہ اس پر پچھتاتے اور افسوس کرتے تھے اکثر مجھے ازراہِ شفقت مبارکباد دیتے اور اظہارِ رشک کرتے کہ تم نے عربی زبان اور دینی علوم ہی کو مضبوطی سے پکڑا اور "یک در گیر و محکم گیر" پر عمل کیا، درحقیقت اس توفیق میں بھی ان کا حصہ تھا۔ میں جب پہلی بار ۱۹۲۹ء میں لاہور حاضر ہوا تو انہوں نے مجھے اپنے کالج کے پرنسپل اور مشہور فاضل و محقق مشرقیات و اسلامیات مولوی محمد شفیع صاحب ایم اے کینٹب (جو تقسیم کے بعد انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اردو کے نگران مقرر ہوئے) سے ملایا اور میرے بعض عربی مضامین دکھا کر ان سے میرے مستقبل کے بارے میں مشورہ لیا کہ مجھے کون سی لائن اختیار کرنی چاہیئے، اس زمانہ میں بہت سے لوگ جو میری باتیں سُن کر میری صلاحیت کے متعلق غلط و خلافِ واقعہ تاثر لیتے تھے، مجھے آئی سی ایس وغیرہ کی لائن اختیار کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ خدا مولوی صاحب مرحوم کو جنت نصیب کرے کہ انہوں نے بہت جزم و وثوق کے ساتھ مشورہ دیا کہ میں صرف عربی زبان اور اس کے متعلقات ہی میں کمال پیدا کروں اور اسلامیات پر کام کرنے کے لئے کسی ایک مغربی زبان میں بھی جس میں فرینچ کو ترجیح ہے، کچھ استعداد پیدا کر لوں، برسوں کے بعد جب ان سے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے دفتر میں ملاقات ہوئی تو میں نے ان کے صائب مشورہ کا ذکر کیا، اور اپنے تشکر و امتنان کا اظہار کیا، بہرحال مولانا سید طلحہ صاحب نے انگریزی کی طرف توجہ کی اور امتحانات کا سلسلہ شروع کیا، ان کا قاعدہ تھا کہ جس چیز کی طرف توجہ کرتے وہ ان پر پوری طور پر طاری ہو جاتی، اور وہ اس میں ڈوب جاتے، ہر وقت اس کا مطالعہ، ہر وقت اس کا تذکرہ، اس کے

ماہر اساتذہ سے استفادہ و مشورہ چنانچہ جب تک لاہور رہے وہ اپنے مضامین الیف سی کالج اور گورنمنٹ کالج کے انگریز پروفیسروں کو دکھاتے، غالباً سنہ ۲۵ء تھا کہ انہوں نے بی اے کی تیاری کے لئے طویل چھٹی لی. اور کئی مہینہ لکھنؤ میں قیام کیا، اس زمانہ میں انہوں نے پروفیسر سدھانت سے اصلاح لینی شروع کی جو انگریزی کے مسلم الثبوت ادیب، لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے صدر تھے اور بعد میں دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے، ان سے تعارف غالباً ان کے دوست و میرے استاد شیخ خلیل عرب صاحب نے کرایا تھا جو اس وقت لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے استاد تھے.

مولانا سید طلحہ صاحب کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی تھا، ان کے لئے کسی زبان و علم کی قید نہ تھی، اس کا نتیجہ تھا کہ شیکسپیئر کے ڈراموں کے بند کے بند اور گولڈا سمتھ وغیرہ کی عبارتیں ان کو یاد تھیں، انگریزی ادب و تاریخ کی مشہور کتاب "جولیس سیزر"، انہوں نے بڑے انہماک سے پڑھی تھی. اس کے جملے بعض مرتبہ جھوم جھوم کر سناتے، مگر انگریزی میں انہوں نے جو محنت کی تھی اور جوان کے علم و مشاغل سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی تھی، ان کے کچھ زیادہ کام نہ آئی. اور معاشی مسئلہ اور عہدہ کی ترقی میں تو اس نے کچھ بھی مدد نہ کی ان کا رزق آخر تک عربی علوم دینیہ ہی سے وابستہ رہا اور بقول ان کے وہ اسی علم کی روٹی کھاتے رہے، یہاں تک کہ سنہ ۱۳۶۱ھ (سنہ ۱۹۴۲ء) میں وہ اپنی خواہش پر اورینٹل کالج سے سبکدوش ہو گئے اور ان ڈگریوں سے جو توقع تھی وہ بھی جاتی رہی.

ان کو مطالعہ میں بڑا انہماک تھا، اور ان کی اصل غذا، ذوق اور طبی (

(HOBBY) کسی نئی مفید کتاب کا پڑھنا تھا۔کوئی پُرا ز معلومات و پُرمغز کتاب مل جاتی تو ان کو دنیا و ما فیہا کا ہوش نہ رہتا۔اس کا مطالعہ بھی کرتے اور اس کا پاس بیٹھنے والوں سے تذکرہ بھی۔ مطالعہ کے وقت ان کے لئے، بشرطیکہ کتاب ان کی ہو سُرخ پنسل ضروری تھی، جو مقامات اور جملے پسند آتے ان پر سُرخ پنسل پھیر کر بالکل رنگین کر دیتے۔ بعض اوقات کتاب دیوالی کا کھلونا معلوم ہوتی۔ان پر ایک ایک دور میں ایک ایک مصنف اور ایک ایک کتاب حاوی رہی ہے۔ میں نے "الندوہ" (دور سوم) کی ادارت کے زمانہ میں مشاہیر اہلِ علم کو اپنی محسن کتابوں کا تذکرہ کرنے اور مصنّفین اور کتابوں سے تاثر کے اظہار کی دعوت دی، ہندوستان کے متعدد نامور اہلِ علم نے اس پر خامہ فرسائی کی۔میری فرمائش اور اصرار پر انہوں نے بھی اس بحث میں حصہ لیا۔ان کا مضمون بڑا پُرا ز معلومات اور اساتذہ و طلباء کے لئے خاص طور پر مفید اور معلومات افزا ہے ان مضامین کا مجموعہ میرے محترم دوست مولانا حافظ محمد عمران خان صاحب ندوی نے "مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں" کے نام سے شائع کر دیا ہے، اس میں ان کے اصل خیالات اور علمی و تعلیمی زندگی کے تجربات دیکھے جا سکتے ہیں۔

مولانا کو صرف و نحو کی تعلیم میں ملکۂ راسخ حاصل تھا۔ان کی تعلیم میں نظری مسائل و جزئیات سے زیادہ علمی مشق اور قواعد کے اجراء پر زور تھا۔انہوں نے صرف و نحو کے عملی مسائل کا جن کی روز مرّہ کی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے، ایک مختصر سا نصاب اور فہرست تیار کر لی تھی اور پہلے وہ انہیں کی مشق کراتے تھے میری صرف و نحو کی محدود علمی صلاحیت انہیں کی مرہونِ منّت ہے، میرے

علاوہ ان کے حقیقی بھانجے برادر عزیز مولوی سید احمد الحسنی (جن کو عربی انگریزی میں یکساں قدرت حاصل تھی اور وہ عربی اہلِ زبان کی طرح بولتے اور لکھتے ہیں) اور خواہرزادہ عزیز محمد ثانی سلمہٗ کو صرف ونحو میں ان سے استفادہ کا خاص موقع ملا۔ وہ غلطی کو بہت مشکل سے معاف کرتے تھے اور کئی روز تک بعض اوقات ہفتوں تک اس پر ملامت اور تکلیف کے اظہار کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس کی وجہ سے دوبارہ غلطی کرنے کی ہمت نہ پڑتی اور بہت چوکنا رہنا پڑتا۔

میں نے ان سے ادب وزبان کی بھی بعض کتابیں پڑھیں لیکن زیادہ تر استفادہ صرف ونحو میں تھا۔ وہ سیبویہ کی "الکتاب" کے بڑے عاشق وشیدائی تھے۔ اسی طرح زمخشری کی "مفصّل" کو بھی بہت پسند کرتے تھے اور اس سے طلبہ کو روشناس کراتے رہتے تھے۔ ابنِ حاجب کی دو مشہور کتابوں میں سے "کافیہ" کو ناپسند کرتے تھے، مگر "شافیہ" کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ اس کی شرح رضی کو بھی بہت سراہتے تھے علامہ سیوطی کی کتابوں میں "المزہر" ان کے بہت مطالعہ میں رہتی تھی، اور ادب کے طلباء کو اس کے پڑھنے کی بہت ترغیب دیتے تھے۔ دینیات میں ان کو صحیح بخاری سے محبت وعقیدت ہی نہیں عشق تھا۔ یہ بقول ان کے نتیجہ تھا۔ مولانا سیف الرحمٰن صاحب کی تعلیم کا جو بخاری کے شیدائیوں میں سے تھے مولانا سید طلحہ صاحب اس کی کوئی حدیث یا سند کا ٹکڑا جھوم جھوم پڑھتے اور ان کو پھر بھی اس کے مطالعہ سے سیری نہ ہوتی۔ ہدایہ کے بھی بڑے قائل تھے اور ان کا خیال تھا کہ اس کے پڑھنے سے فقہ حنفی سے مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنے ادبی ذوق اور فنِ بلاغت سے مناسبت کی وجہ سے کشاف کے بڑے دلدادہ

تھے، اور وہ اکثر ان کے مطالعہ میں رہتی، ادبیات و شعریات میں وہ شعر العجم کے بڑے گرویدہ اور فریفتہ تھے۔ مولانا شبلیؒ کے طرز تحریر و سوانح نگاری کے بڑے قائل و معترف تھے۔ آزاد کی آبِ حیات بھی وہ مزے لے لے کر پڑھتے تھے۔

مجھے ان کی کتابی تعلیم سے زیادہ ان کی علمی صحبتوں سے نفع پہنچا اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ میرے ذہن کی تربیت و تشکیل اور میرے ذوق و معلومات میں، جس کو ایک مفرد لفظ "ثقافت" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ان کا بہت بڑا حصہ ہے، ان کا ایک بڑا تعلیمی فیض یہ تھا کہ اپنی تحریر کو بار بار شک اور تنقید کی نگاہ سے دیکھتے۔ عربی الفاظ و صلات کے صحیح استعمال کا اطمینان کرنے اور معاجم (کتبِ لغت) کی طرف بار بار مراجعت کرنے کی عادت پڑ گئی۔ ہندوستانی علماء اور عربی میں لکھنے والوں کے لئے بڑی آزمائش، یہ ہے کہ اردو میں سینکڑوں الفاظ عربی کے استعمال ہوتے ہیں، مگر ہندوستان میں آنے کے بعد ان کے معنی و مفہوم اور محل استعمال اکثر بدل گیا ہے۔ عربی ساخت ہونے کی وجہ سے ہندوستانی ان کو اپنی عربی تحریروں میں بے تکلف استعمال کرتے ہیں، لیکن ٹھیٹھ عرب اور ادیب ان کے وہ معنی ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔ جو ہندوستان میں سمجھے جاتے ہیں۔ مولانا طلحہ صاحب ان الفاظ کے بارے میں بڑی احتیاط کرتے تھے اور ان کا شک اور تأمل وہم کی حد تک پہنچ گیا تھا، لیکن عربی کے ایک مضمون نگار کی حیثیت سے جس کی تحریروں کے اصل مخاطب اہلِ عرب تھے۔ مجھے ان کے اس تشکک اور احتیاط سے بڑا فائدہ پہنچا ہے۔

ان کا دوسرا ذوق مجلس آرائی، لطفِ صحبت اور علمی و تاریخی تذکرے تھے۔ ان

کو ہر جگہ اور ہر دور میں ایسے لوگوں کی تلاش رہتی جوان کی فراغت کے اوقات میں گھنٹوں ان کے پاس بیٹھیں۔ اور گفتگو میں شریک ہوں۔ ان کو بہت دیر میں نیند آتی تھی، اس لئے رات دیر تک ان کی مجلس جمی رہتی۔ وہ کسی کو اٹھنے نہ دیتے تھے۔ بعض اوقات یہ بہت سے عزیزوں اور شاگردوں کے لئے جو بوڑھے طور پر ایسی علمی مجلسوں سے لطف نہ اٹھا سکتے یا جلد سو جانے کے عادی اور نیند کے بیمار تھے، بڑی آزمائش کی بات ہوتی۔ اور مجھ جیسے کم ہمت تو اکثر اس سے منہ چُراتے اور کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے رخصت ہو جاتے۔ اسی درمیان میں اگر کوئی نیا ستارہ طلوع ہو جاتا، یا تاروں بھری رات ہوتی اور ان کو کسی ضرورت سے باہر آنا ہوتا تو وہ اپنے ہم نشینوں کو اس موقع سے فائدہ اٹھانے اور ان ستاروں سے واقف ہونے پر اصرار کرتے۔ ان مجلسوں میں وہ جن لوگوں سے زیادہ مانوس ہوتے ان کو شریک کرتے اور دیر تک اپنے پاس بیٹھنے پر اصرار کرتے۔ یہ خصوصیت عزیزوں میں مجھے اور خواہر زادہ عزیز مولوی محمد ثانی سلمہٗ نیز محترمی سید عقیل صاحب (جو ان کے پھوپھی زاد بھائی تھے) اور عزیزی سید عامر حسنی کو حاصل تھی۔ عزیزی محمد ثانی حسنی سلمہٗ پر وہ بہت شفیق تھے اور ان کی سعادت و صلاحیت سے بہت متاثر، تاریخی سنین و فرائض اور نجوم وغیرہ میں ان کو ان سے بہت فائدہ پہنچا اور بہت سے چٹکلے انہوں نے ایسے یاد کرائے جو بڑی بڑی کتابوں میں نہیں ملتے۔ اہلِ علم اور دوستوں میں مولانا شاہ حکیم عطا صاحب سلونی مرحوم سابق شیخ الحدیث دار العلوم ندوۃ العلماء، مولانا حکیم حسن مثنیٰ صاحب امروہوی مرحوم سے ان کو بہت موانست تھی اور وہ ان کے بہت کچھ ہم مذاق اور شریک

کمال تھے۔ اساتذہ میں مولانا حیدر حسن خان صاحب سے ان کی خاص صحبت و مجلس رہتی اور جب کبھی (لکھنؤ کے قیام میں) وہ مولانا کے پاس ندوۃ آجاتے تو آدھی آدھی رات تک دونوں کی باتیں رہتیں۔ گزشتہ تاریخ و واقعات کے دفتر کھل جاتے، اس مجلس کا خاص موضوع ٹونک سے اخراج کے واقعات و اسباب اور اس کی اہم شخصیتیں اور کردار ہوتے[1]، اکثر صبح کو مولانا حیدر حسن خان صاحب کو شکایت کرتے سنا کہ میاں طلحہ نے رات بھر سونے نہیں دیا۔ لیکن اگلی رات پھر یہی ہوتا۔ اور مولانا شدت تعلق اور اس دلچسپ و مشترک موضوع کی وجہ سے بھر رات کی نیند ان کی نذر کر دیتے۔ مگر اپنی روحانی قوت و علمی ذوق کی وجہ سے مطالعہ و تدریس اور طبیعت کی شگفتگی میں فرق نہ آنے دیتے۔

معاصر اہل علم اور اہل دین میں وہ مولانا انور شاہ کشمیری کے وسعت مطالعہ اور وسعت معلومات کے بڑے قائل تھے، دیوبند و لاہور میں ان سے ملاقاتیں

---

[1] ۱۹۲۱ء میں جب تحریک خلافت کا زور تھا۔ بعض لوگوں کی ریشہ دوانی سے والیٔ ریاست نواب ابراہیم علی خان مرحوم کو سادات قافلہ سے جو حضرت سید احمد شہید رح کے خلاف داعیہ رکھتے تھے، یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ وہ ان کو بے دخل کر کے ریاست پر قبضہ کر لیں گے اس سے متاثر ہو کر انہوں نے ان کی جاگیریں ضبط کر لیں اور چند گھنٹے کے اندر ریاست چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ مولانا طلحہ صاحب کا سارا خاندان اس زد میں آگیا، ان کی جاگیریں ضبط ہو گئیں اور وہ لوگ اپنے قدیم وطن دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں آ کر مقیم ہو گئے۔ نواب صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد ان حضرات کو وہاں واپس جانا نصیب ہوا مگر جاگیریں واپس نہ ہوئیں

ہوتی رہتیں، اور جب کبھی شاہ صاحب کا کشمیر جاتے ہوئے لاہور کے اسٹیشن سے گذر ہوتا تو وہ پابندی سے ملاقات کے لئے جاتے اور پھر اس مجلس کا لطف د افادہ دیکھنے کے قابل ہوتا. شاہ صاحب بھی ان سے بہت مانوس و بے تکلف تھے.

مولانا سیف الرحمٰن صاحب کے فہم و فراست اور زندگی کے وسیع تجربات کے بڑے قائل و مداح تھے. اور اکثر ان کا تذکرہ کرتے تقویٰ و ورع و زہد میں اپنے خاندان کے دو بزرگوں مولانا سیّد عرفان صاحب ٹونکی اور ان کے برادر اصغر مولانا سیّد مصطفیٰ صاحب ٹونکی کے بڑے معتقد اور ان کی تعریف میں رطب اللسان رہتے یہ دونوں حضرات حضرت سید احمد شہیدؒ کے حقیقی نواسے تھے. اور عامل بالحدیث؛ ان دونوں خاندانی بزرگوں کے علاوہ وہ خاندان غزنویہ کے بزرگوں بالخصوص حضرت مولانا سید عبد الجبار صاحب غزنوی کا بڑی عقیدت و عظمت سے ذکر کرتے تھے اور ان کے مؤثر واقعات سُناتے تھے. اپنے عزیزوں اور بزرگوں میں بلکہ طبقۂ علماء میں وہ والد مرحوم مولانا حکیم عبد الحیٔ صاحب کی شخصیت و علمی کمالات سے بہت متاثر تھے، انہوں نے اپنی دس برس کی عمر سے لے کر ان کی وفات تک ان کی زندگی کا ایک گھر میں رہ کر مطالعہ کیا تھا. ان کا تذکرہ بھی ان کی مجلس کا ایک خاص موضوع تھا. وہ نظری طور پر تقلید کے پابند نہ تھے. لیکن عملاً اور تقریباً تمام معاملات و عبادات میں فقہ حنفی پر عامل تھے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ بزرگانِ دیوبند کے اخلاص و للّٰہیت کے بڑے قائل و معترف تھے. حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کا بڑے بلند الفاظ میں تذکرہ کرتے تھے. مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، جو لکھنؤ میں ہمیشہ ڈاکٹر عبد العلی صاحب مرحوم کے یہاں قیام فرماتے تھے.

اور اس تقریب سے اکثر مولانا سید طلحہ صاحب سے صحبت و مجلس رہتی، بڑی عقیدت و تواضع سے ملتے اور مولانا اکثر ان سے مزاح فرماتے حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح کی حکمتِ دینی ان کے مواعظ اور کتابوں نافعیت و تاثیر اور مولانا محمد الیاس صاحب رح کے اخلاص کے بہت قائل تھے۔ نومبر ۱۹۴۳ء میں جب پھوپھی صاحبہ مرحومہ کے انتقال پر دہ نظام الدین آئے تو مولانا نے سید صاحب کے تعلق کی وجہ سے ان کا ایسا احترام کیا جو میں نے بہت کم لوگوں کو دیکھا ہے سردیوں کا زمانہ تھا۔ انگیٹھی ذرا فاصلہ پر رکھی تھی۔ دستر خوان بچھایا گیا تو مولانا ایک ایک روٹی گرم گرم کر کے لاتے اور خود پیش کرتے، یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا اور مولانا نے صاحبزادۂ گرامی منزلت مولانا محمد یوسف صاحب رح کو بھی اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ یہ خدمت انجام دیں۔ اس سفر میں وہ چند روز کے لئے میوات بھی گئے، چند روز حضرت مولانا عبدالقادر صاحب کی خدمت میں رائے پور میں بھی قیام کیا اور حضرت نے بھی بڑا احترام فرمایا۔

مولانا سید طلحہ صاحب میں زندہ دلی اور شگفتگی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ اپنے لطیفوں سے ہنساتے اور راستہ چلتے لوگوں کو ٹھہرا لیتے، ہر بات میں کوئی پہلو ہوتا تھا، نئے نئے نام رکھتے تھے۔ اور مزے مزے کی چٹکیاں لیتے تھے، اس شگفتگی اور زندہ دلی میں سب سے پہلے اس وقت فرق آیا جب ان کے قابلِ فخر اور محبوب ترین بھائی سید محمد عمر صاحب حسنی انجنیئر نے ۱۳۶۰ھ (۱۹۴۱ء) میں ریاست جونا گڑھ میں انتقال کیا۔ سید عمر صاحب مرحوم مکارم اخلاق، انسانی شرافت و محامد کا ایک عجیب نمونہ تھے، یہ موقع تفصیل سے ان کے تذکرہ کا نہیں ہے، مولانا

سید طلحہ صاحب ان کی شخصیت سے بے حد متاثر اور ان کی محبت سے سرشار تھے وہ ان کو اپنے خاندان کا ایک ہیرا اور نگینہ سمجھتے تھے۔ اور واقعہ بھی یہی تھا۔ ان کی بے نفسی، صلہ رحمی، فیاضی و ایثار اور ان کا توازن و اعتدال ان کے لئے روشنی کا ایک مینار رہا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی طبیعت میں ایسا اضمحلال پیدا ہوا کہ ملازمت میں جی نہ لگا، اور ۱۳۶۱ھ (۱۹۴۲ء) میں اپنی خواہش سے اورینٹل کالج کی خدمات سے سبکدوشی حاصل کر لی۔ دوسرا حادثہ میری پھوپھی صاحبہ کا انتقال تھا۔ اس واقعہ نے کہنا چاہیے کہ ان کی کمر توڑ دی اور ان کی زندگی میں ایک عظیم تغیر رُونما ہو گیا۔ اگرچہ انہوں نے اس کے بعد دو عقد کئے۔ بالکل آخر عمر میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک لڑکا (سید داؤد سلمہٗ) عنایت فرمایا۔ لیکن وہ شگفتہ دلی اور زندہ دلی، بے فکری اور اطمینان پھر نصیب نہیں ہوا، ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہ زیادہ تر وقت لکھنؤ میں صرف کرنے لگے میرے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم سے ان کو بڑا اُنس تھا۔ اور ان کا ان کے پاس بہت جی لگتا تھا۔ غالباً ۴۴-۱۹۴۵ء میں انہوں نے لکھنؤ میں طویل قیام کیا اور ادارۂ تعلیماتِ اسلامیہ میں جو انگریزی داں لوگوں کو قرآن شریف سے متعارف کرنے اور آسان عربی سکھانے کے لئے قائم ہوا تھا۔ اور جس کے ناظم و روحِ رواں ہمارے دوست مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوائی (حال ناظم دینیات جامعہ ملیہ دہلی) تھے۔ وہ کچھ وقت دیتے تھے اس کے علاوہ ان کا سارا وقت مطالعہ اور لطف صحبت میں گذرتا۔ وہ ۱۹۴۸ء میں پاکستان منتقل ہو گئے اور کراچی میں انہوں نے مستقل قیام کر لیا۔ پاکستان سے وہ صرف دو مرتبہ ہندوستان آئے، ایک مرتبہ

۵۰ئہ میں لیکن اس وقت میرا قیام مصر و حجاز میں تھا۔ اس لئے اس کے متعلق کچھ نہیں لکھ سکتا، دوسری مرتبہ ۵۵ئہ کے آخر میں آئے، غالباً چھ مہینہ کے قریب رہے قیام کا بیشتر حصہ لکھنؤ اور بھوپال میں گذارا۔ لکھنؤ میں وہ عرصہ تک دار العلوم ندوۃ العلماء میں مقیم رہے جہاں وہ کتب خانہ سے اپنی زیر تصنیف عربی کتاب "عہد صحابہ کا تمدن" کے لئے مواد جمع کرتے، اور مطالعہ و تحریر کے کام میں مشغول رہتے تھے۔

دار العلوم کے زمانۂ قیام میں نوجوان اساتذہ نے ان کی علمی مجالس اور مذاکرات سے بہت فائدہ اُٹھایا۔ بھوپال میں ان کے بعض بڑے پرانے احباب تھے، جن میں ان کے فاضل دوست مفتی رضوان الدین صاحب اور ان کے عزیز شاگرد ملا احسن علی اور نور محل کے متعدد اعزہ و افراد خاندان خاص طور پر قابل ذکر ہیں بھوپال کے زمانۂ قیام میں وہ حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتے تھے، حضرت بھی ان سے بہت مانوس اور ان کی وسعتِ معلومات اور تاریخ و رجال سے واقفیت کے بڑے معترف تھے۔ میرے سامنے کئی مرتبہ ان کی تشریف آوری اور بعض علمی افادات کا ذکر فرمایا۔

کراچی میں کچھ عرصہ کے بعد ان کا تعلق دار التصنیف لمیٹڈ سے ہو گیا۔ یہ ادارہ مولانا طفیل احمد صاحب دیوبندی کی سرپرستی میں کام کر رہا ہے۔ ان کا کام یہ تھا کہ اس ادارہ کے ماتحت ہونے والے ترجمہ قرآن انگریزی پر نظر ثانی کریں اور اپنی وسیع و گہری دینی و لسانی واقفیت کی روشنی میں مشورہ دیں، مولانا طفیل احمد صاحب نے ان کی بڑی قدر اور اعانت فرمائی۔ کچھ عرصہ مولانا دار العلوم شرافی

کو زندگی کراچی میں بھی رہے وہ مفتی محمد شفیع صاحب سے بہت مانوس اور ان کے علم وفضل کے بہت معترف تھے۔ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب سے بھی بہت بے تکلف تھے۔

ان کی عمر و صحت کسی ملازمت اور باقاعدہ تعلق کے قابل نہیں تھی، اگر اللہ تعالیٰ کراچی کے دیندار اہل ثروت کو عقل و توفیق سے بہرہ یاب فرماتا، تو ایسے صاحب کمال و جامع صفات عالم کو عزت و سکون کے ساتھ اپنے گھر میں بیٹھ کر اور آزادی کے ساتھ مطالعہ و افادہ میں مصروف رہ کر باطمینان زندگی گذارنے کا موقع فراہم کرتے لیکن ایسا نہیں ہوا، اور یہ زمانہ ان کے بڑے تفکر و تنگی میں گذرا جس کا قلق ان کے سب عزیزوں اور شاگردوں اور احسان مندوں کو عمر بھر رہے گا۔ جنہوں نے لاہور میں ان کے مکان پر مہینوں اور برسوں رہ کر تعلیم حاصل کی۔ جن کی فہرست خاصی طویل ہے۔ وہ بعض مکانی یا قانونی دقتوں کی وجہ سے خدمت سے قاصر رہے۔

ادھر پے در پے ایسے حوادث پیش آئے کہ انہوں نے ان کی زندگی کو اور بے لطف بلکہ مجموعۂ آلام بنا دیا۔ ان کو اپنے منجھلے بھائی سیّد عمر صاحب کے بعد سب سے زیادہ محبت اپنی اکیلی بہن (والدہ برادر عزیز سید احمد الحسنی سلمہ) سے تھی ۱۹۶۸ء میں انہوں نے دفعتاً داغ مفارقت دیا، چند ہی روز کے فصل سے آگے پیچھے ان کے سب سے بڑے بھائی ابو حمزہ سید زبیر حسنی صاحب نے انتقال کیا اور کچھ ہی عرصہ کے بعد ان کے سب سے چھوٹے بھائی سید محمد علی صاحب حسنی نے جو تقسیم کے بعد بھی ہندوستان میں رہے اور ۱۹۶۸ء میں کراچی منتقل ہوئے اور وہاں پہنچنے کے صرف نو مہینہ کے بعد اچانک اس دنیا سے کوچ کیا، دو بھائیوں اور

ایک بہن کے پے در پے انتقال نے ان کی ساری شگفتگی اور زندہ دلی ختم کر دی، میری آخری ملاقات جب اپریل ۶۹ء کو کراچی کے ہوائی اڈے پر ہوئی تو وہ جب تک میرے پاس رہے روتے رہے، زار و نزار جسم جو کبھی پُر گوشت اور بارعب اور باوجاہت تھا، مرتعش جسم کانپتی ہوئی آواز کو دیکھ کر عبرت ہوتی تھی کہ یہ وہی انسان ہے جو اپنے جلو میں کتنی بہاریں، کتنی دلنوازیاں، کتنی رونقیں اور کتنا لطف وانبساط رکھتا تھا۔ آج ایک مرقع عبرت اور تصویر حسرت بنا ہوا ہے، مولوی محمد حسین آزاد نے آب حیات میں میر سید انشاء کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ مولانا سید طلحہ کے حسب حال ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"بعض فلاسفۂ یونان کا قول ہے کہ مدت حیات انسان کی سانسوں کے شمار پر ہے، میں کہتا ہوں کہ ہر شخص جس قدر سانس یا جتنا رزق اپنا حصہ لایا ہے۔ اسی طرح ہر شئے کو جس میں خوشی کی مقدار اور ہنسی کا اندازہ بھی داخل ہے وہ لکھوا کر لایا ہے، سید موصوف نے اس ہنسی کی مقدار کو جو عمر بھر کے لئے تھی تھوڑے وقت میں صرف کر دیا باقی وقت یا تو خالی رہا یا غم کا حصہ ہو گیا" (آب حیات، ص ۲۹۳)

مجھ سے بار بار فرماتے تھے کہ کئی دن کے لئے آؤ اور ساتھ رہو، خطوط میں بھی اسی کی فرمائش اور خواہش کرتے رہے اور مشکل سے کوئی خط ان کا اس سے خالی جاتا تھا، کیا معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات تھی۔

ان کا اصل ذوق کتابوں کا مطالعہ اور معلومات میں اضافہ تھا۔ تصنیف و تالیف سے ان کو کچھ زیادہ مناسبت نہ تھی، شاید ان کا وفور علم اور ذوق مطالعہ اپنی

معلومات کو منضبط و منظم طریقہ پر پیش کرنے سے مانع ہوتا ہو۔ پھر ان کو پابندیوں اور ضوابط سے فطری مناسبت نہ تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انہوں نے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ نہ کی، اپنی جوانی کے زمانے میں جب ان کا کچھ عرصہ بھوپال میں طویل قیام رہا تھا۔ تو نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ والئ ریاست کی فرمائش یا اشارہ سے امُّ المومنین حضرت ام سلیمؓ کی سیرت لکھی جس کا ان کو معاوضہ ملا لیکن چھپنے کی نوبت نہ آئی۔

لاہور کے زمانۂ قیام میں ۱۹۲۹ء میں پنجاب ایڈوائزری بورڈ فار بکس نے ولیم ٹامسن ورٹے باٹ کے عربی انگریزی لغت کو اردو میں منتقل کرنے کا کام ان کے سپرد کیا، لیکن کام کے وسیع ہونے کی وجہ سے اس میں انہوں نے اپنے بہت سے تلامذہ و احباب کو شریک کر لیا۔ یہ لغت ۱۹۳۸ء میں چھپی لیکن کتاب میں کہیں ان کا نام نہیں ہے۔ شروع میں ۳۵ صفحے کا ان کا ایک فاضلانہ و ناقدانہ مقدمہ ہے جس میں بہت سے لغوی و نحوی فوائد آگئے ہیں۔

ان کی اصل علمی یادگار ان کی فاضلانہ عربی کتاب کا وہ نامکمل مسودہ ہے جو انہوں نے عہدِ صحابہ کے تمدن و معاشرت اور علمی زندگی پر سالہا سال سے لکھنی شروع کی تھی۔ اور اس کے سلسلے میں انہوں نے ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۷ء) اپنے قدرداں اور دوست ڈاکٹر عبدالوہاب عزام سابق سفیر مصر متعینہ پاکستان کی مدد سے حجاز، مصر و شام اور ترکی کا سفر کیا تھا تاکہ وہاں کے نادر روزگار کتب خانوں سے استفادہ کریں اور کتاب کے لئے نیا مواد مہیا کریں۔ ان کی آرزو یہ تھی کہ یہ کتاب ان کی زندگی میں شائع ہو جائے۔ لیکن نہ وہ اس کو مکمل